حقیقت کی تلاش

مولانا وحید الدّین خاں

حقیقت کی تلاش

مولانا وحید الدین خاں

Haqiqat ki Talash

By Maulana Wahiduddin Khan

This book has also been ublished as a chapter in

Islam Aur Asr-e-Hazir

First published 1984

Reprinted 2025

This book is copyright free and royalty free. It can be translated, reprinted, stored or used on any digital platform without prior permission from the author or the publisher. It can be used for commercial or non-profit purposes. However, kindly do inform us about your publication and send us a sample copy of the printed material or link of the digital work.

e-mail: info@goodwordbooks.com

CPS International

Centre for Peace and Spirituality International

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013, India

e-mail: info@cpsglobal.org

www.cpsglobal.org

Goodword Books

A-21, Sector 4, Noida-201301

Delhi NCR, India

e-mail: info@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Center for Peace and Spirituality USA

2665 Byberry Road, Bensalem, PA 19020, USA

e-mail: kkaleemuddin@gmail.com

Printed in India

بسم اللہ الرحمن رحیم

فہرست

دیباچہ	4
حقیقت کی تلاش	5
خالق کی تلاش	6
معبود کی تلاش	12
انجام کی تلاش	19
انسان کی نارسائی	28
پیغمبر کی ضرورت	30
پیغمبر کی صداقت	34
قرآن اپنی دلیل آپ	38
آخری بات	48

دیباچہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے ستمبر 1958ء میں اسلامی تقریروں کا ایک ہفتہ منایا گیا جس میں مختلف علماء اور مفکرین نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں کیں۔ اس سلسلہ کا عنوان تھا —— سلسلۂ تقاریر اسلام:

Series of Lectures on Islam

اس موقع پر راقم الحروف نے 6 ستمبر 1958ء کو یونیورسٹی کے یونین ہال میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر بعد کو اردو میں "حقیقت کی تلاش" اور عربی میں "الفحص عن الحق" کے نام سے شائع ہوئی۔ زیر نظر کتاب اسی تقریر کا نظر ثانی کیا ہوا ایڈیشن ہے۔

مکتبہ الرسالہ کی طرف سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سے کچھ علمی اسلوب میں ہیں اور کچھ سادہ اسلوب میں۔ زیر نظر کتاب سادہ اسلوب والی کتابوں کی فہرست میں ایک اضافہ ہے۔ اس کو اسلام کے عمومی تعارف کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وحید الدین

5 دسمبر 1983ء

حقیقت کی تلاش

کائنات ایک بہت بڑی کتاب کی مانند ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے مگر یہ ایک ایسی انوکھی کتاب ہے جس کے کسی صفحے پر اس کا موضوع اور اس کے مصنف کا نام تحریر نہیں، اگرچہ اس کتاب کا ایک ایک حرف بول رہا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہوسکتا ہے اور اس کا مصنف کون ہے۔

جب کوئی شخص آنکھ کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ ایک وسیع وعریض کائنات کے درمیان کھڑا ہے تو بالکل قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ — "میں کیا ہوں اور یہ کائنات کیا ہے" وہ اپنے آپ کو اور کائنات کو سمجھنے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ اپنی فطرت میں سموئے ہوئے اشارات کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا میں وہ جن حالات سے دوچار ہورہا ہے، چاہتا ہے کہ ان کے حقیقی اسباب معلوم کرے۔غرض اس کے ذہن میں بہت سے سوالات اٹھتے ہیں جن کا جواب معلوم کرنے کے لیے وہ بے قرار ہوتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ ان کا جواب کیا ہے۔

یہ سوالات محض فلسفیانہ قسم کے سوالات نہیں ہیں بلکہ یہ انسان کی فطرت اور اس کے حالات کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن سے دنیا میں تقریباً ہر شخص کو ایک بار گزرنا ہوتا ہے۔جن کا جواب نہ پانے کی صورت میں کوئی پاگل ہو جاتا ہے، کوئی خودکشی کر لیتا ہے، کسی کی ساری زندگی بے چینیوں میں گذر جاتی ہے، اور کوئی اپنے حقیقی سوال کا جواب نہ پاکر نشہ آور چیزوں یا ظاہر فریب تماشوں میں کھوجاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان میں گم ہوکر اس ذہنی پریشانی سے نجات حاصل کرلے وہ جو کچھ حاصل کرسکتا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں اس کو بھلا دیتا ہے جس کو وہ حاصل نہ کرسکا۔

اس سوال کو ہم ایک لفظ میں "حقیقت کی تلاش" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کریں تو یہ بہت سے سوالات کا مجموعہ نکلے گا۔ یہ سوالات کیا ہیں ان کو مختلف الفاظ میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں آسانی کے لیے ان کو مندرجہ ذیل تین عنوانات کے تحت بیان کروں گا۔

1۔ خالق کی تلاش

2۔ معبود کی تلاش

3۔ اپنے انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش دراصل نام ہے ان ہی تینوں سوالات کا جواب معلوم کرنے کا۔ آپ خواہ جن الفاظ میں بھی اس سوال کی تشریح کریں مگر حقیقۃً وہ اسی کی بدلی ہوئی تعبیر ہوگی اور ان ہی تین عنوانات کے تحت انھیں اکٹھا کیا جاسکے گا۔

بظاہر یہ سوالات ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، اور نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نظر آتا ہے جہاں ان کا جواب لکھ کر رکھ دیا گیا ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو سوال ہے اسی کے اندر اس کا جواب موجود ہے۔ کائنات اپنی حقیقت کی طرف آپ اشارہ کرتی ہے، اگرچہ وہ ہم کو یقینی علم تک نہیں لے جاتی۔ لیکن یہ اشارہ اتنا واضح اور قطعی ہے کہ اگر ہم کو کسی ذریعہ سے حقیقت کا علم حاصل ہو جائے تو ہمارا ذہن پکار اٹھتا ہے کہ یقینا یہی حقیقت ہے، اس کے سوا کائنات کی کوئی اور حقیقت نہیں ہوسکتی۔

خالق کی تلاش

کائنات کو دیکھتے ہی جو سب سے پہلا سوال ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ اس کا بنانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو چلا رہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی اَن دیکھی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں۔ ایک بڑے خدا کے

تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب بھی بہت سے لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر علمی دنیا میں عام طور پر اب یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔ آج یہ ایک مردہ نظریہ ہے نہ کہ زندہ نظریہ۔ موجودہ زمانہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں۔ وہ شرک کے بجائے الحاد کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آئیں گے۔ اس طرح اسباب وواقعات کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلۂ اسباب ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس توجیہہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک اتفاق اور دوسرے قانون علت (Law of Causation)۔

یہ توجیہ بتاتی ہے کہ اب سے تقریباً دو لاکھ ارب سال (20 نیل سال) پہلے کائنات کا وجود نہ تھا۔ اس وقت ستارے تھے اور نہ سیارے، مگر فضا میں مادہ موجود تھا۔ یہ مادہ اس وقت جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا، بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ گویا انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا، اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ ریاضی کے نقطہ گاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا بھی خلل ڈال دے تو پھر یہ قائم نہیں رہ سکتا، یہ خلل بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اگر اس ابتدائی خلل کو مان لیجیے تو ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد کے تمام واقعات علمِ ریاضی کے ذریعہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مادے کے اس بادل میں خفیف سا خلل واقع ہوا جیسے کسی حوض کے پانی کو کوئی ہاتھ ڈال کر ہلا دے۔ کائنات کی پر سکون دنیا میں یہ اضطراب کس نے پیدا کیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ لیکن خلل

ہوا اور یہ خلل بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے، سیارے اور سحابیے کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدر بودی اور کمزور توجیہ ہے کہ خود سائنس دانوں کو بھی اس پر کبھی شرحِ صدر حاصل نہ ہو سکا۔ یہ توجیہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی مگر اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کائنات کے محرکِ اول کو معلوم کرلیا ہے، اور اس محرکِ اول کا نام اس کے نزدیک اتفاق ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا، اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب وغریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی۔ جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادہ کے باہر۔ وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے۔ اس توجیہ کا یہ نہایت دل چسپ تضاد ہے کہ وہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے مگر اس توجیہ کی ابتدا ایک ایسے واقعہ سے ہوتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں۔ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پر کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کردی گئی ہے۔

پھر یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انھوں نے اختیار کیا۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔ مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے اور حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ موجود کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔ آخر وہ

کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہات باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کردیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظامِ شمسی کو وجود دیا۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جس سے ہمارے کرۂ زمین پر وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک کائنات کی بیشمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں بھی معلوم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہ کون سی منطق تھی جو ایک خاص مرحلہ پر بے جان مادہ سے جاندار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لیے درکار تھیں، پھر وہ کون سی منطق ہے جو ان حالات کو ہمارے لیے باقی رکھے ہوئے ہے۔ کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسنِ ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک ان کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آنے والے واقعہ میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی اور اتنے عجیب و غریب طریقہ پر مسلسل ارتقاء کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہو گیا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ اس کا چلانے والا کون ہے۔ وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظم طریقہ پر حرکت دے رہا ہے۔ اس توجیہ میں جس کو کائنات کا خالق قرار دیا گیا ہے اسی کو کائنات کا حاکم نہیں قرار دیا جا سکتا یہ توجیہ عین اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے۔ کیوں کہ حرکتِ

اول کی توجیہ کے لیے تو اتفاق کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اس کے بعد کی مسلسل حرکت کو کسی حال میں بھی اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی توجیہ کے لیے دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اصول تعلیل (Principle of Causation) پیش کیا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ نا قابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ما قبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ حتی کہ جس صورت میں تاریخِ عالم کا آغاز ہوا، اس نے آئندہ سلسلہ واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ جب ابتدائی صورت ایک دفعہ معین ہو گئی تو قدرت صرف ایک ہی طریق سے منزل مقصود تک پہنچ سکتی تھی۔ گویا کائنات جس روز پیدا ہوئی اس کی آئندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی ہے۔

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آ گئی۔ یہ زمانہ سائنس داں انجینیروں کا تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں۔ اسی زمانہ میں ہیلم ہولٹز (Helm Holtz) نے کہا تھا کہ تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر لینا ہے۔ اگر چہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنسدانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی مگر ان کا یقین تھا کہ کائنات

کی تشریح میکانکی پیرائے میں ہوسکتی ہے وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا۔

ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ اصولِ تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت کی ہر کامیابی میکانکی تشریح نے اختیار انسانی پر یقین کرنا محال بنا دیا، کیوں کہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی اس سے کیوں مستثنیٰ ہوسکتی ہے۔ اس طرز فکر کے نتیجہ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے میکانکی فلسفے وجود میں آئے۔ جب یہ دریافت ہوا کہ جاندار خلیہ (Living Cell) بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزاء جن سے ہمارے جسم و دماغ بنے ہوئے ہیں کیوں کر اصول تعلیل کے دائرہ سے باہر ہوسکتے ہیں چنانچہ یہ گمان کیا گیا بلکہ بڑے جوش کے ساتھ دعویٰ کر دیا گیا کہ زندگی بھی ایک خالص مشین ہے یہاں تک کہا گیا کہ نیوٹن، باخ (Bach) اور مائیکل انجلو (Michel Angelo) کے دماغ کسی پرنٹنگ مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔

مگر سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصولِ علیت کی اب قائل نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت اصول تعلیل کو دھوکے (Elusion) کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر ہی میں سائنس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر، بالخصوص روشنی اور قوت کشش، میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا ایسی مشین بنائی جاسکتی ہے جو نیوٹن کے افکار، باخ کے جذبات اور مائیکل انجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے مگر سائنس دانوں کو بڑی تیزی سے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شمع کی روشنی اور سیب کا گرنا کوئی مشین نہیں دہرا سکتی۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کرسکتی ہے جو اول روز سے علت اور معلول کی مسلسل

کڑی کے مطابق ابد تک کے لیے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پر اس کے مستقبل کا سبب نہیں ہے جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (Non-mechanical Reality) کی طرف لیے جا رہا ہے۔

کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارے میں یہ دونوں نظریئے جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اس نظریہ کی تردید کر رہی ہے، اب انسان دوبارہ اسی منزل پر پہنچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا نیا سفر شروع کیا تھا۔

معبود کی تلاش

یہ خالق کی تلاش کا مسئلہ تھا۔ اس کے بعد دوسری چیز جو انسان جاننا چاہتا ہے وہ یہ کہ ”میرا معبود کون ہے“، ہم اپنی زندگی میں صریح طور پر ایک خلا محسوس کرتے ہیں مگر ہم نہیں جانتے کہ اس خلا کو کیسے پر کریں۔ یہی خلا کا احساس ہے جس کو میں نے ”معبود کی تلاش“ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ احساس دو پہلوؤں سے ہوتا ہے۔

اپنے وجود اور باہر کی دنیا پر جب ہم غور کرتے ہیں تو دو نہایت شدید جذبے ہمارے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا شکر اور احسان مندی کا اور دوسرا کمزوری اور عجز کا۔

ہم اپنی زندگی کے جس گوشہ میں بھی نظر ڈالتے ہیں ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ ہماری زندگی کسی کے احسانات سے ڈھکی ہوئی ہے یہ دیکھ کر دینے والے کے لیے ہمارے اندر

بے پناہ جذبۂ شکر امنڈ تا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنی بہترین عقیدتوں کو اپنے محسن پر قربان کر سکیں۔ یہ تلاش ہمارے لیے محض ایک فلسفیانہ نوعیت کی چیز نہیں ہے بلکہ ہماری نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ہے یہ سوال محض ایک خارجی مسئلہ کو حل کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ ہماری ایک اندرونی طلب ہے اور ہمارا پورا وجود اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے۔

غور کیجیے، کیا کوئی شریف آدمی اس حقیقت کو نظر انداز کر سکتا ہے کہ وہ کائنات میں ایک مستقل واقعہ کی حیثیت سے موجود ہے حالانکہ اس میں اس کی اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ایک ایسے جسم میں پا رہا ہے جس سے بہتر جسم کا وہ تصور نہیں کر سکتا حالانکہ اس جسم کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ اس کو ایسی عجیب وغریب قسم کی ذہنی قوتیں حاصل ہیں جو کسی بھی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئی ہیں حالاں کہ ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کچھ بھی نہیں کیا ہے اور نہ وہ کچھ کر سکتا ہے۔ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ عطیہ ہے۔ یہ عطیہ کس نے دیا ہے، انسانی فطرت اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتی ہے تا کہ وہ اپنے اس عظیم محسن کا شکر ادا کر سکے۔

پھر اپنے جسم کے باہر دیکھئے۔ دنیا میں ہم اس حال میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا، نہ ہم کو کائنات کے اوپر کوئی اختیار حاصل ہے کہ ہم اس کو اپنی ضرورت کے مطابق بنا سکیں۔ ہماری ہزاروں ضرورتیں ہیں۔ مگر کسی ایک ضرورت کو بھی ہم خود سے پورا نہیں کر سکتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں حیرت انگیز طور پر ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس بات کی منتظر ہے کہ انسان پیدا ہو اور وہ اس کی خدمت میں لگ جائے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجیے جس کے ذریعہ سے ہم اپنا خیال دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ہمارے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات زبان کا ارتعاش بن کر

دوسرے کے کان تک پہنچیں اور وہ ان کو قابل فہم آوازوں کی صورت میں سن سکے۔ اس کے لیے ہمارے اندر اور باہر بیشمار انتظامات کیے گئے ہیں جن میں سے ایک وہ درمیانی واسطہ ہے جس کو ہم ہوا کہتے ہیں۔ ہم جو الفاظ بولتے ہیں وہ بے آواز لہروں کی صورت میں ہوا پر اسی طرح سفر کرتے ہیں جس طرح پانی کی سطح پر موجیں پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میرے منھ سے نکلی ہوئی آواز کے آپ تک پہنچنے کے لیے درمیان میں ہوا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ درمیانی واسطہ نہ ہو تو آپ میرے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھیں گے مگر میری آواز نہ سنیں گے۔ مثال کے طور پر ایک بند فانوس کے اندر برقی گھنٹی رکھ کر اسے بجایا جائے تو اس کی آواز صاف سنائی دے گی۔ لیکن اگر فانوس کے اندر کی ہوا کو پوری طرح نکال دیا جائے اور اس کے بعد گھنٹی بجائی جائے تو آپ شیشہ کے اندر گھنٹی کو بجتا ہوا دیکھیں گے مگر اس کی آواز بالکل سنائی نہ دے گی۔ کیوں کہ گھنٹی کے بجنے سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس کو قبول کر کے آپ کے کانوں تک پہنچانے کے لیے فانوس کے اندر ہوا موجود نہیں ہے۔

مگر یہ ذریعہ بھی ناکافی ہے کیونکہ ہوا کے ذریعہ ہماری آواز پانچ سکنڈ میں صرف ایک میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہوا کا ذریعہ صرف قریبی ماحول میں گفتگو کے لیے کارآمد ہے، وہ ہماری آواز کو دور تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر آواز صرف ہوا کے ذریعہ پھیلتی تو اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ مگر قدرت نے اس کے لیے ہمیں ایک اور انتہائی تیز رفتار ذریعہ مہیا کیا ہے، یہ روشنی یا برقی رو ہے جس کی رفتار ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ لاسلکی پیغامات میں اسی ذریعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب کوئی مقرر ریڈیو اسٹیشن میں لگے ہوئے مائکروفون کے قریب آواز نکالتا ہے تو مائکروفون آواز کو جذب کر کے اسے برقی رو میں تبدیل کر دیتا ہے اور تار کے ذریعہ اس کو آلہ نشر یا ٹرانس میٹر تک بھیج دیتا ہے۔

آلات نشر آواز کے پہنچتے ہی مرتعش ہو کر فضا میں وہی ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح پانچ سکنڈ میں ایک میل چلنے والی آواز برقی لہروں میں تبدیل ہو کر ایک سکنڈ میں دو لاکھ میل کی رفتار حاصل کر لیتی ہے۔ اور دم بھر میں ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یہی لاسلکی موجیں ہیں جن کو ہمارے ریڈیو سٹ کی آواز گیر مشین قبول کر کے بلند آواز میں ان کا اعادہ کر دیتی ہے اور پھر ہزاروں میل دور بولی ہوئی آواز کو ہم کسی تاخیر کے بغیر سننے لگتے ہیں۔

یہ ان بیشمار انتظامات میں سے ایک ہے جس کو میں نے بیان کیا ہے بلکہ اس کا صرف نام لیا ہے۔ اگر اس کا اور دوسری چیزوں کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو اس کے لیے کروروں صفحے درکار ہوں گے اور پھر بھی ان کا بیان ختم نہ ہوگا۔

یہ عطیات جن سے ہر آن آدمی دو چار ہو رہا ہے اور جن کے بغیر اس زمین پر انسانی زندگی اور تمدن کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا، انسان جاننا چاہتا ہے کہ یہ سب کس نے اس کے لیے مہیا کیا ہے ہر آن جب وہ کسی نعمت سے دو چار ہوتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے محسن کو پائے اور اپنے آپ کو اس کے قدموں میں ڈال دے۔ محسن کے احسانات کو ماننا، اس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا اور اس کی خدمت میں اپنے بہترین جذبات کو نذر کرنا یہ انسانی فطرت کا شریف ترین جذبہ ہے۔ ہر آدمی جو اپنی زندگی اور کائنات پر غور کرتا ہے اس کے اندر نہایت شدت سے یہ جذبہ ابھرتا ہے۔ پھر کیا اس جذبہ کا کوئی جواب نہیں۔ کیا انسان اس کائنات کے اندر ایک یتیم بچہ ہے جس کے اندر امنڈتے ہوئے جذبات محبت کی تسکین کے لیے کوئی ہستی موجود نہ ہو۔ کیا یہ ایک ایسی کائنات ہے جہاں احسانات ہیں مگر محسن کا پتہ نہیں۔ جہاں جذبہ ہے مگر جذبہ کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہیں۔

یہ معبود کی تلاش کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کے حالات فطری

طور پر تقاضا کرتے ہیں کہ کائنات کے اندر اس کا کوئی سہارا ہو۔ اگر ہم آنکھ کھول کر دیکھیں تو ہم اس دنیا میں ایک انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہیں۔ ذرا اس خلا کا تصور کیجئے جس میں ہماری یہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کی گولائی تقریباً 25 ہزار میل ہے۔ اور وہ ناچتے ہوئے لٹو کے مانند اپنے محور پر مسلسل اس طرح گھوم رہی ہے کہ ہر 24 گھنٹے میں ایک چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی رفتار تقریباً ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ سورج کے چاروں طرف اٹھارہ کرور ساٹھ لاکھ میل کے لمبے دائرہ میں نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہے۔

خلا کے اندر اس قدر تیز دوڑتی ہوئی زمین پر ہمارا وجود قائم رکھنے کے لیے زمین کی رفتار کو ایک خاص اندازہ کے مطابق رکھا گیا ہے اگر ایسا نہ ہو تو زمین کے اوپر انسان کی حالت ان سنگ ریزوں کی مانند ہو جائے جو کسی متحرک پہیہ پر رکھ گئے ہوں، اسی کے ساتھ مزید انتظام یہ ہے کہ زمین کی کشش ہم کو کھینچے ہوئے ہے اور اوپر سے ہوا کا زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑ رہا ہے وہ جسم کے ہر مربع انچ پر پندرہ پونڈ تک معلوم کیا گیا ہے، یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً 280 من کا دباؤ۔ ان حیرت انگیز انتظامات نے ہم کو خلا میں مسلسل دوڑتی ہوئی زمین کے چاروں طرف قائم کر رکھا ہے۔

پھر ذرا سورج پر غور کیجیے۔ سورج کی جسامت آٹھ لاکھ 65 ہزار میل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج آگ کا دہکتا ہوا سمندر ہے جس کے قریب کوئی بھی چیز ٹھوس حالت میں نہیں رہ سکتی۔ زمین اور سورج کے درمیان اس وقت تقریباً ساڑھے نو کرور میل کا فاصلہ ہے، اگر اس کے بجائے وہ اس کے نصف فاصلہ پر ہو تو سورج کی گرمی سے چیزیں جلنے لگیں۔ اور اگر وہ چاند کی جگہ یعنی دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر آجائے تو زمین پگھل کر بخارات میں تبدیل ہو جائے۔ یہی سورج

ہے جس سے زمین پر زندگی کے تمام مظاہر قائم ہیں۔ اس مقصد کے لیے اس کو ایک خاص فاصلہ پر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ دور چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے اور اگر قریب آجائے تو ہم سب لوگ جل بھن کر خاک ہو جائیں۔

پھر ذرا اس کائنات کی وسعت کو دیکھیے اور اس قوتِ کشش پر غور کیجیے جو اس عظیم کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کائنات ایک بے انتہا وسیع کارخانہ ہے، اس کی وسعت کا اندازہ ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ ہے کہ روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے، اس کو کائنات کے گرد ایک چکر طے کرنے میں کئی ارب برس درکار ہوں گے۔ یہ نظام شمسی جس کے اندر ہماری زمین ہے، بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے مگر پوری کائنات کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اس سے بہت بڑے بڑے بے شمار ستارے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں بہت سے اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا پورا نظام شمسی اس کے اوپر رکھا جا سکتا ہے۔ جو قوت کشش ان بیشمار دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کی عظمت کا تصور اس سے کیجئے کہ سورج جس بے پناہ طاقت سے زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کو وسیع ترین فضا میں گر کر برباد ہو جانے سے روکتا ہے، یہ غیر مرئی طاقت اس قدر قوی ہے کہ اگر اس مقصد کے لیے کسی مادی شے سے زمین کو باندھنا پڑتا تو جس طرح گھاس کی پتیاں زمین کو ڈھانکے ہوئے ہیں، اسی طرح دھاتی تاروں سے کرۂ ارض ڈھک جاتا۔

ہماری زندگی بالکلیہ ایسی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہے جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ انسان کی زندگی کے لیے دنیا میں جو انتظامات ہیں اور جن کی موجودگی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، وہ اتنے بلند پیمانہ پر ہو رہے ہیں اور ان کو وجود میں لانے کے لیے اتنی غیر معمولی قوت تصرف درکار ہے کہ انسان خود سے انھیں وجود میں لانے کا تصور نہیں کر سکتا

موجودات کے لیے جو طریق عمل مقرر کیا گیا ہے، اس کا مقرر کرنا تو درکنار اس پر کنٹرول کرنا بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگر کائنات کی غیر معمولی قوتیں میرے ساتھ ہم آہنگی نہ کریں تو میں زمین پر ٹھہر بھی نہیں سکتا، اس کے اوپر ایک متمدن زندگی کی تعمیر تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسی ایک کائنات کے اندر جب انسان اپنے حقیر وجود کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ بے بس محسوس کرنے لگتا ہے جتنا کہ سمندر کی موجوں کے درمیان ایک چیونٹی اپنے آپ کو بچانے کی جدوجہد کر رہی ہو۔ وہ بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو اس اتھاہ کائنات میں اس کا سہارا بن سکے۔ وہ ایک ایسی ہستی کی پناہ ڈھونڈھنا چاہتا ہے جو کائنات کی قوتوں سے بالاتر ہو اور جس کی پناہ میں آجانے کے بعد وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون تصور کر سکے۔

یہ دو جذبے ہیں جن کو میں نے معبود کی تلاش کا عنوان دیا ہے۔ معبود کی تلاش دراصل ایک فطری جذبہ ہے جس کا مطلب ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے جو آدمی کی محبت اور اس کے اعتماد کا مرکز بن سکے۔ موجودہ زمانہ میں قوم، وطن اور ریاست کو انسان کی اس طلب کا جواب بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جدید تہذیب یہ کہتی ہے کہ اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنی ریاست کو یہ مقام دو کہ وہ تمہاری عقیدتوں کا مرکز بنے اور اس سے وابستگی کو اپنا سہارا بناؤ۔ ان چیزوں کو معبود کے نام پر پیش نہیں کیا جاتا مگر زندگی میں ان کو جو مقام دیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو دراصل ایک معبود کا ہونا چاہیے۔ مگر ان چیزوں کو معبود کی جگہ دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کو ایک رفیق زندگی کی ضرورت ہو تو اس کی خدمت میں آپ پتھر کی ایک سل پیش کر دیں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے اندر تلاش کا یہ جذبہ جو ابھرتا ہے اس کے اسباب انسانی نفسیات میں بہت گہرائی تک پھیلے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسی ہستی کی تلاش

میں ہے جو ساری کائنات پر محیط ہو۔ اس طلب کا جواب کسی جغرافیائی خطہ میں نہیں مل سکتا۔ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ ایک سماج کی تعمیر میں کچھ مدد دے سکتی ہیں مگر وہ انسان کے تلاش معبود کے جذبے کی تسکین نہیں بن سکتیں، اس کے لیے ایک کائناتی وجود درکار ہے۔ انسان کو اپنی محبتوں کے مرکز کے لیے ایک ایسا وجود چاہیے جس نے زمین وآسمان کو بنایا ہو۔ اپنے سہارے کے لیے اسے ایک ایسی طاقت کی تلاش ہے جو کائنات کے اوپر حکمراں ہو۔ جب تک انسان ایسے ایک وجود کو نہیں پائے گا اس کا خلا بدستور باقی رہے گا، کوئی دوسری چیز اسے پُر کرنے والی نہیں بن سکتی۔

انجام کی تلاش

حقیقت کی تلاش کا تیسرا جزء اپنے انجام کی تلاش ہے۔ آدمی یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ وہ اپنے اندر بہت سے حوصلے اور تمنائیں پاتا ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کی تسکین کس طرح ہوگی۔ وہ موجودہ محدود زندگی کے مقابلہ میں ایک طویل تر زندگی چاہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ وہ اس کو کہاں پائے گا۔ اس کے اندر بہت سے اخلاقی اور انسانی احساسات ہیں جو دنیا میں بری طرح پامال کیے جارہے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ اپنی پسندیدہ دنیا کو حاصل نہ کر سکے گا۔ یہ سوالات کس طرح انسان کے اندر سے ابلتے ہیں اور کائنات کا مطالعہ کس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتا ہے، اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل مناسب ہوگی۔

ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں تین لاکھ برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس کے مقابلہ میں کائنات کی عمر بہت زیادہ ہے یعنی دو لاکھ ارب سال (20 نیل سال)۔ اس سے پہلے کائنات برقی ذرات کے ایک غبار کی شکل میں تھی، پھر اس میں

حرکت ہوئی اور مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے، سیارے یا سحابئے کہتے ہیں ۔ یہ مادی ٹکڑے گیس کے مہیب گولے کی شکل میں نا معلوم مدت تک فضا میں گردش کرتے رہے ۔تقریباً دو ارب سال پہلے ایسا ہوا کہ کائنات کا کوئی بڑا استارہ فضا میں سفر کرتا ہوا آفتاب کے قریب آنکلا جو اس وقت اب سے بہت بڑا تھا۔جس طرح چاند کی کشش سے سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اسی طرح اس دوسرے ستارے کی کشش سے ہمارے آفتاب پر ایک عظیم طوفان برپا ہوا، زبردست لہریں پیدا ہوئیں جو رفتہ رفتہ نہایت بلند ہوئیں اور قبل اس کے کہ وہ ستارہ آفتاب سے دور ہٹنا شروع ہو، اس کی قوت کشش اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ آفتاب کی ان زبردست گیسی لہروں کے کچھ حصّے ٹوٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور فضا میں نکل گئے ۔یہی بعد کو ٹھنڈے ہو کر نظام شمسی کے تو ابع بنے ۔اس وقت سے یہ سب ٹکڑے آفتاب کے گرد گھوم رہے ہیں اور ان ہی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔

زمین ابتداءً ایک شعلہ کی حالت میں سورج کے گرد گھوم رہی تھی، مگر پھر فضا میں مسلسل حرارت خارج کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی ، یہ عمل کروروں برس ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہو گئی ۔مگر سورج کی گرمی اب بھی اس پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے بخارات اٹھنا شروع ہوئے اور گھٹاؤں کی شکل میں اس کی فضا کے اوپر چھا گئے ۔ پھر یہ بادل برسنا شروع ہوئے اور ساری زمین پانی سے بھر گئی ۔زمین کا اوپری حصہ اگرچہ ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ اب بھی گرم تھا،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سکڑنے لگی۔اس کی وجہ سے زمین کے اندر کی گرم گیسوں پر دباؤ پڑا اور وہ باہر نکلنے کے لیے بے قرار ہوگئیں، تھوڑے عرصے کے بعد زمین پھٹنے لگی ۔جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ گئے،اس طرح بحری طوفانوں، خوفناک زلزلوں اور آتش فشاں دھماکوں میں ہزاروں سال گزر گئے ۔ان ہی زلزلوں سے زمین کا کچھ حصہ اوپر ابھر آیا اور کچھ حصہ دب گیا۔ دبے ہوئے حصوں مین پانی بھر گیا اور وہ سمندر

کہلائے اور ابھرے ہوئے حصوں نے براعظم کی صورت اختیار کی بعض اوقات یہ ابھار اس طرح واقع ہوا کہ بڑی بڑی اونچیں باڑھیں سی بن گئیں، یہ دنیا کے پہلے پہاڑ تھے۔

ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ ایک ارب 23 کرور سال ہوئے ، جب پہلی بار زمین پر زندگی پیدا ہوئی ۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جو پانی کے کنارے وجود میں آئے ۔اس کے بعد مختلف قسم کے جانور پیدا ہوتے اور مرتے رہے ۔ کئی ہزار سال تک زمین پر صرف جانور رہے ۔ اس کے بعد سمندری پودے نمودار ہوئے اور خشکی پر بھی گھاس اگنا شروع ہوئی ۔اس طرح لمبی مدت تک بے شمار واقعات ظہور میں آتے رہے، یہاں تک کہ انسانی زندگی کے لیے حالات سازگار ہوئے اور زمین پر انسان پیدا ہوا۔

اس نظریہ کے مطابق انسان کی ابتداء پچھلے تین لاکھ سال سے ہوئی ہے ۔ یہ مدت بہت ہی کم ہے ۔ وقت کے جو فاصلے کائنات نے طے کیے ہیں ان کے مقابلہ میں انسانی تاریخ چشم زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ۔ پھر اگر انسانیت کی اکائی کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی عمر کا اوسط سو سال سے بھی کم ہے ۔ایک طرف اس واقعہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ کائنات میں انسان سے بہتر کوئی وجود معلوم نہیں کیا جا سکا ہے ۔زمین و آسمان کی اربوں اور کھربوں سال کی گردش کے بعد جو بہترین مخلوق اس کائنات کے اندر وجود میں آئی ہے وہ انسان ہے ۔مگر یہ حیرت انگیز انسان جو ساری دنیا پر فوقیت رکھتا ہے، جو تمام موجودات میں سب سے افضل ہے اس کی زندگی چند سال سے زیادہ نہیں ۔ ہمارا وجود جن مادی اجزاء سے مرکب ہے ان کی عمر تو اربوں اور کھربوں سال ہو اور وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائین مگر ان مادی اجزاء کی یکجائی سے جو اعلیٰ ترین وجود بنتا ہے وہ صرف سو برس زندہ رہے ۔ جو کائنات کا حاصل ہے وہ کائنات سے بھی کم عمر رکھتا ہے تاریخ کے طویل ترین دور میں بے شمار واقعات کیا صرف اس لیے جمع ہوئے تھے کہ ایک انسان کو چند دنوں کے لیے پیدا کر کے ختم ہو جائیں۔

زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو اس پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جا سکتا ہے جو طول و عرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جا کر ایک ہلکا سا دھکا دے دیں تو یہ صندوق پانی کی گہرائی میں جا گرے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی، نسل انسانی اپنے کفن میں لپٹی ہوئی ہمیشہ کے لیے پڑی رہے گی، دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں کبھی انسان کی قسم کی کوئی نسل آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا، کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور چکر کرتا رہے گا، کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے حادثہ کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ کئی صدیوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندروق میں دفن کی گئی تھی۔

کیا انسان کی قیمت بس اسی قدر ہے، مادہ کو کوٹیے، پیٹیے، جلائیے، کچھ بھی کیجیے، وہ ختم نہیں ہوتا، وہ ہر حال میں اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ مگر انسان جو مادہ سے برتر مخلوق ہے کیا اس کے لیے بقا نہیں۔ یہ زندگی جو ساری کائنات کا خلاصہ ہے، کیا وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ اتنی آسانی سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا انسانی زندگی کا منتہا بس یہی ہے کہ وہ کائنات میں اپنے ننھے سے وطن پر چند دنوں کے لیے پیدا ہو اور پھر فنا ہو کر رہ جائے تمام انسانی علم اور ہماری کامرانیوں کے سارے واقعات ہمارے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور کائنات اس طرح باقی رہ جائے گویا نسل انسانی کی اس کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز جو صریح طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے تو یہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں ہماری امنگوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ہر

انسان لامحدود مدت تک زندہ رہنا چاہتا ہے، کسی کو بھی موت پسند نہیں، مگر اس دنیا میں ہر پیدا ہونے والا جانتا ہے کہ وہ ایسی زندگی سے محروم ہے۔ آدمی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے، ہر آدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ دکھ درد اور ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہ کر زندگی گزارے، مگر حقیقی معنوں میں کیا کوئی شخص بھی ایسی زندگی حاصل کرسکتا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو اپنے حوصلوں کی تکمیل کا آخری حد تک موقع ملے، وہ اپنی ساری تمناؤں کو عمل کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے مگر اس محدود دنیا میں وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، یہ کائنات اس کے لیے بالکل ناسازگار معلوم ہوتی ہے وہ ہر چند قدم کے بعد ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے، کائنات صرف ایک حد تک ہمارا ساتھ دیتی ہے، اس کے بعد ہم کو مایوس اور ناکام لوٹا دیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی محض غلطی سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے جو دراصل اس کے لیے نہیں بنائی گئی تھی اور جو بظاہر زندگی اور اس کے متعلقات سے بالکل بے پروا ہے۔ کیا ہمارے تمام جذبات وخیالات اور ہماری تمام خواہشیں غیر حقیقی ہیں جن کا واقعی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے تمام بہترین تخیلات کائنات کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں بالکل الل ٹپ طریقے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ تمام احساسات جن کو لے کر انسانی نسل پچھلے ہزاروں سال سے پیدا ہو رہی ہے اور جن کو اپنے سینہ میں لیے ہوئے وہ اس حال میں دفن ہو جاتی ہے کہ وہ انھیں حاصل نہ کرسکی، کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں۔ کیا وہ انسانوں کے ذہن میں بس یونہی پیدا ہو رہے ہیں جن کے لیے نہ تو ماضی میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مستقبل میں ان کا کوئی مقام ہے۔

ساری کائنات میں صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے

آیندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جانور مثلاً چیونٹیاں خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا گھونسلے بناتا ہے۔ مگر ان کا یہ عمل غیر شعوری طور پر محض عادتاً ہوتا ہے۔ ان کی عقل اس کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انھیں خوراک جمع کر کے رکھنا چاہیے تاکہ کل ان کے کام آسکے یا ایسا گھر بنانا چاہیے جو موسموں کے ردو بدل میں تکلیف سے بچائے۔ انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو تمام دوسری چیزوں سے زیادہ موقع ملنا چاہیے، جانوروں کے لیے زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے، کیا اسی طرح انسانی زندگی کا بھی کوئی کل نہیں ہے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، فردا (future) کا تصور جو انسان میں پایا جاتا ہے اس کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کی زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہو جتنی آج اسے حاصل ہے انسان "کل" چاہتا ہے مگر اس کو صرف "آج" دیا گیا ہے۔

اسی طرح جب ہم سماجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک خلا کا زبردست احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف مادی دنیا ہے جو اپنی جگہ پر بالکل مکمل نظر آتی ہے۔ وہ ایک متعین قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کی ہر چیز اپنے مقرر راستہ پر چلی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادی دنیا ویسی ہی ہے جیسی کہ اسے ہونا چاہیے مگر انسانی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے۔ یہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔

ہم صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے اور دونوں اس حال میں مر جاتے ہیں کہ ایک ظالم ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم۔ کیا ظالم کو اس کے ظلم کی سزا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ دیے بغیر دونوں کی زندگی کو مکمل کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص سچ بولتا ہے اور حق داروں کو ان کے حقوق ادا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی مشکل کی زندگی بن جاتی ہے، دوسرا شخص جھوٹ اور فریب سے کام لیتا ہے اور جس کی جو چیز پاتا ہے ہڑپ کر لیتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی نہایت عیش و عشرت کی زندگی

بن جاتی ہے۔ اگر یہ دنیا اسی حال میں ختم ہو جائے تو کیا دونوں انسانوں کے اس مختلف انجام کی کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر ڈاکہ ڈالتی ہے اور اس کے وسائل وذرائع پر قبضہ کر لیتی ہے مگر اس کے باوجود دنیا میں وہی نیک نام رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس نشر واشاعت کے ذرائع ہیں اور دبی ہوئی قوم کی حالت سے دنیا ناواقف رہتی ہے کیونکہ اس کی آہ کے دنیا کے کانوں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں، کیا ان دونوں کی صحیح حیثیت کبھی ظاہر نہیں ہوگی۔ دو اشخاص یا دو قوموں میں ایک مسئلہ پر اختلاف ہوتا ہے اور زبردست کش مکش تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو برسر حق کہتے ہیں اور ایک دوسرے کو انتہائی برا ثابت کرتے ہیں مگر دنیا میں ان کے مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہوتا، کیا ایسی کوئی عدالت نہیں ہے جو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر سکے۔

موجودہ دور کو اینٹی دور کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کو خودسری کا دور کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ آج کا انسان صرف اپنی رائے اور خواہش پر چلنا چاہتا ہے خواہ اس کی رائے اور خواہش کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ہر شخص غلط کار ہے مگر ہر شخص گلے کی پوری قوت کے ساتھ اپنے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔ اخبارات میں لیڈروں اور حکمرانوں کے بیانات دیکھیئے، ہر ایک انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے ظلم کو عین انصاف اور اپنی غلط کاریوں کو عین حق ثابت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیا اس فریب کا پردہ کبھی چاک ہونے والا نہیں۔

یہ صورت حال صریح طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ یہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے ایک ایسی دنیا چاہیے جہاں ہر ایک کو اس کا صحیح مقام مل سکے۔

مادی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کوئی خلا ہے اس کو پُر کرنے کے اسباب موجود ہیں۔ مادی دنیا میں کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس انسانی دنیا میں ایک زبردست خلا ہے۔ جس قدرت نے مادی دنیا کو مکمل حالات میں ترقی دی ہے کیا اس کے

پاس انسانی دنیا کا خلا پر کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ ہمارا احساس بعض افعال کو اچھا اور بعض کو برا سمجھتا ہے۔ ہم کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ وہ ہوں اور کچھ باتوں کو چاہتے ہیں کہ وہ نہ ہوں۔ مگر ہماری فطری خواہش کے علی الرّغم وہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے جس کو انسانی فطرت برا سمجھتی ہے، انسان کے اندر اس طرح کے احساس کی موجودگی یہ معنیٰ رکھتی ہے کہ کائنات کی تعمیر حق پر ہوئی ہے۔ یہاں باطل کے بجائے حق کو غالب آنا چاہیے۔ پھر کیا حق ظاہر نہیں ہوگا۔ جو چیز مادی دنیا میں پوری ہو رہی ہے کیا وہ انسانی دنیا میں پوری نہیں ہوگی۔

یہی وہ سوالات ہیں جن کے مجموعہ کو میں نے اوپر "انسانیت کے انجام کی تلاش" کہا ہے۔ ایک شخص جب ان حالات کو دیکھتا ہے تو وہ سخت بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر نہایت شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ زندگی اگر یہی ہے جو اس وقت نظر آ رہی ہے تو یہ کس قدر لغو زندگی ہے۔ وہ ایک طرف دیکھتا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے کائنات میں اس قدر اہتمام کیا گیا ہے گویا سب کچھ صرف اسی کے لیے ہے، دوسری طرف انسان کی زندگی اس قدر مختصر اور اتنی ناکام ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کس لیے پیدا کیا گیا ہے۔

اس سوال کے سلسلہ میں آج لوگوں کا رجحان عام طور پر یہ ہے کہ اس قسم کے جھنجھٹ میں پڑنا فضول ہے۔ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں، اور حقیقت پسندی یہ ہے کہ زندگی کا جو لمحہ تمہیں حاصل ہے اس کو پر مسرت بنانے کی کوشش کرو۔ آیندہ کیا ہوگا یا جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط، اس کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اس جواب کے بارے میں کم از کم بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں انھوں نے ابھی انسانیت کے مقام کو نہیں پہچانا، وہ مجاز کو حقیقت سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ واقعات انھیں ابدی زندگی کا راز معلوم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں مگر وہ چند روزہ زندگی پر قانع ہو گئے ہیں۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ اپنی امنگوں اور حوصلوں کی تکمیل کے

لیے ایک وسیع تر دنیا کی تلاش کرو مگر یہ نادان روشنی کے بجائے اس کے سایہ کو کافی سمجھ رہے ہیں۔ کائنات پکار رہی ہے کہ یہ دنیا تمہارے لیے نامکمل ہے، دوسری مکمل دنیا کا کھوج لگاؤ۔ مگر ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اسی نامکمل دنیا میں اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں گے، ہم کو مکمل دنیا کی ضرورت نہیں۔ حالات کا صریح اشارہ ہے کہ زندگی کا ایک انجام آنا چاہیے۔ مگر یہ لوگ صرف آغاز کو لے کر بیٹھ گئے ہیں اور انجام کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ حالانکہ یہ اسی قسم کی ایک حماقت ہے جو شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے۔ اگر فی الواقع زندگی کا کوئی انجام ہے تو وہ آ کر رہے گا اور کسی کا اس سے غافل ہونا اس کو روکنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ البتہ ایسے لوگوں کے حق میں وہ ناکامی کا فیصلہ ضرور کرسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو کل زندگی سمجھنا اور صرف آج کو پر مسرت بنانے کی کوشش کو اپنا مقصد بنالینا بڑی کم ہمتی اور بے عقلی کی بات ہے۔ آدمی اگر اپنی زندگی اور کائنات پر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس نقطۂ نظر کی لغویت فوراً واضح ہو جاتی ہے ایسا فیصلہ وہی کرسکتا ہے جو حقیقتوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلے اور بالکل بے سمجھی بوجھی زندگی گزارنا شروع کردے۔

یہ ہیں وہ چند سوالات جو کائنات کو دیکھتے ہی نہایت شدت کے ساتھ ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہیے، مگر اس کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ اس کا ایک چلانے والا اور اس کو سنبھالنے والا ہونا چاہیے، مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ ہم کسی کے احسانات سے ڈھکے ہوئے ہیں اور مجسم شکر و سپاس بن کر اس ہستی کو ڈھونڈھنا چاہتے ہیں جس کے آگے اپنے عقیدہ کے جذبات کو نثار کرسکیں، مگر ایسا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہم اس کائنات کے اندر انتہائی عجز اور بے بسی کے عالم میں ہیں، ہم کو ایک ایسی پناہ کی تلاش ہے جہاں پہنچ کر ہم اپنے آپ کو محفوظ تصور کرسکیں، مگر ایسی کوئی پناہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ پھر جب ہم اپنی زندگی اور اپنی عمر کو دیکھتے ہیں تو

کائنات کا یہ تضاد ہم کو نا قابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی عمر تو کھربوں سال ہو اور انسان جو کائنات کا خلاصہ ہے اس کی عمر چند سال۔ فطرت ہم کو بے شمار امنگوں اور حوصلوں سے معمور کرے مگر دنیا کے اندر اس کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرے۔

پھر سب سے زیادہ سنگین تضاد وہ ہے جو مادی دنیا اور انسانی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ مادی دنیا انتہائی طور پر مکمل ہے، اس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا، مگر انسانی زندگی میں زبردست خلا ہے۔ اشرف المخلوقات کی حالت ساری مخلوق سے بدتر نظر آتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اگر پٹرول کا کوئی نیا چشمہ دریافت ہو یا بھیڑ بکریوں کی نسل بڑھے تو اس سے انسان خوش ہوتا ہے، مگر انسانی نسل کا اضافہ ہمارے لیے گوارہ نہیں۔ ہم اپنی مشکلوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ انسان کی پیدائش کو روک دینا چاہتے ہیں۔

انسان کی نارسائی

یہ سوالات ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، وہ اندر سے بھی ابل رہے ہیں اور باہر سے بھی ہمیں گھیرے ہوئے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا جواب کیا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کا سوال ہے، مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ ہمیں زندگی تو مل گئی مگر اس کی حقیقت ہمیں نہیں بتائی گئی۔

اس حقیقت کی دریافت کے لیے جب ہم اپنی عقل اور اپنے تجربات کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح اور قطعی جواب معلوم کرنا ہماری عقل اور ہمارے تجربہ کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک ہم نے جو رائیں قائم کی ہیں وہ اٹکل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے کے اجسام کو نہیں دیکھ

سکتے، اسی طرح کائنات کے متعلق ہمارا علم بھی ایک تنگ دائرہ میں محدود ہے۔ جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہمارا علم نامکمل ہے، ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں۔ ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔ میدہ اور کالک کو اگر ملایا جائے تو بھورے خاکستری رنگ کا ایک سفوف سا بن جاتا ہے، لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو سفوف کے ذروں ہی کے برابر ہوتا ہے اور صرف خوردبین کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے وہ اس کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے اس کے مشاہدہ کے پیمانہ میں خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔

نوعِ انسانی کی زندگی اس زمانہ کے مقابلہ میں جب کہ یہ کرۂ ارض وجود میں آیا اس قدر مختصر ہے کہ کسی شمار میں نہیں آتی، اور خود کرۂ ارض کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کائنات کی حقیقت کے بارے میں جو خیال آرائی کرتا ہے، اس کو اندھیرے میں ٹٹولنے سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری انتہائی لا علمی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر آپ اس بات کو سامنے رکھیں کہ آفتاب اسّی کھرب سال سے موجود ہے اس زمین کی عمر جس پر ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے، اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تین کرور سال گذر چکے ہیں مگر اسکے مقابلہ میں زمین پر ذی عقل انسان کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں، اس طویل زمانہ کا ایک بہت حقیر جزء ہے جو کہ دراصل کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لیے درکار ہے۔ کائنات کے بے حد طویل ماضی اور نا معلوم مستقبل کے درمیان انسانی زندگی محض ایک لمحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا وجود ایک نہایت حقیر قسم کا درمیانی وجود ہے جس کے آگے اور پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی وسعت لامحدود ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے ہماری عقل اور ہمارا تجربہ بالکل ناکافی ہیں۔ ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے

ذریعہ کبھی بھی اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اب تک کی کوششوں کی ناکامی اس کو ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اس طرح ہمارا علم اور ہمارا مطالعہ ہم کو ایک ایسے مقام پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہیں، ایسے سوالات جو لازمی طور پر اپنا جواب چاہتے ہیں۔ جن کے بغیر انسانی زندگی بالکل لغو اور بے کار نظر آتی ہے۔ مگر جب ہم ان پر سوچنے بیٹھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے ان کا جواب معلوم نہیں کر سکتے۔ ہم کو وہ آنکھ ہی نہیں ملی جس سے حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ اور وہ ذہن ہمیں حاصل نہیں ہے جو براہِ راست حقیقت کا ادراک کر سکے۔

پیغمبر کی ضرورت

اس موقع پر ایک شخص ہمارے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ جس حقیقت کو تم معلوم کرنا چاہتے ہو، اس کا علم مجھے دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

”اس کائنات کا ایک خدا ہے جس نے سارے عالم کو بنایا ہے، اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔ جو چیزیں تمہیں حاصل ہیں وہ سب اسی نے تمہیں دی ہیں اور سارے معاملات کا اختیار اسی کو ہے۔ یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ مادی دنیا کے اندر کوئی تضاد نہیں، وہ ٹھیک ٹھیک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے اور اس کے برعکس انسانی دنیا ادھوری نظر آتی ہے، یہاں زبردست خلفشار برپا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اسے آزمایا جا رہا ہے۔ تمہارا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کا قانون جو مادی دنیا میں براہ راست نافذ ہو رہا ہے اس کو انسان اپنی زندگی میں خود سے اختیار کرے یہی وجود کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مدبر اور منتظم ہے، وہی تمہارے

جذباتِ شکر کا مستحق ہے اور وہی ہے جو تم کو پناہ دے سکتا ہے ۔ اس نے تمہارے لیے ایک لامحدود زندگی کا انتظام کر رکھا ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے ، جہاں تمہاری امنگوں کی تسکین ہو سکے گی ، جہاں حق و باطل الگ الگ کر دیے جائیں گے اور نیکوں کو ان کی نیکی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے گا ۔ اس نے میرے ذریعہ سے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی ہے جس کا نام قرآن ہے ۔ جو اس کو مانے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اس کو نہ مانے گا ذلیل کر دیا جائے گا“ ۔

یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے جو چودہ سو برس پہلے عرب کے ریگستان سے بلند ہوئی تھی اور آج بھی ہم کو پکار رہی ہے ۔ اس کا پیغام ہے کہ اگر حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری آواز پر کان لگاؤ اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر غور کرو ۔

کیا یہ آواز حقیقت کی واقعی تعبیر ہے ، کیا ہمیں اس پر ایمان لانا چاہیے ۔ وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حقیقت کو وہ اس وقت تسلیم کریں گے جب کہ وہ انھیں نظر آئے ۔ وہ حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں ۔ مگر یہ مطالبہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فلکیات کا مطالعہ ریاضی کے بغیر کرنے کی کوشش کرے اور کہے کہ وہ فلکیاتی سائنس کی صرف ان ہی دریافتوں کو تسلیم کرے گا جو کھلی آنکھوں سے اسے نظر آتی ہوں ، ریاضیات کی دلیل اس کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے ، یہ مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی قوتوں کا صحیح علم نہیں ہے ۔

انسان کے پاس مشاہدہ کی جو قوتیں ہیں وہ نہایت محدود ہیں ، حقیقت ہمارے لیے ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے ۔ ہم اسے محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیکھ نہیں سکتے ۔ ایک زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا چار چیزوں سے مل کر بنی ہے ۔ ” آتش و آب و خاک و باد “ ۔ دوسرے لفظوں میں قدیم انسان اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ حقیقت ایک ایسی چیز ہے جسے

دیکھا جاسکتا ہے، مگر جدید تحقیقات نے اس کی غلطی واضح کر دی ہے۔ اب ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنے آخری تجزیہ میں ایٹم کے باریک ترین ذرات پر مشتمل ہیں۔ ایٹم ایک اوسط درجہ کے سیب سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے جتنا کہ سیب ہماری زمین سے۔ یہ ایٹم ایک طرح کا نظام شمسی ہے جس کا ایک مرکز ہے، اس مرکز میں پروٹان اور نیوٹران ہوتے ہیں اور اس کے چاروں طرف الکٹران (برقیے) مختلف مداروں میں اسی طرح حرکت کرتے ہیں جیسے سورج کے گرد اس کے تابع سیارے حرکت کرتے ہیں۔ ایک برقیہ جس کا قطر سینٹی میٹر کا پانچ ہزار کرورواں حصہ ہو اور جو اپنے مرکز کے چاروں طرف ایک سکنڈ میں کروروں مرتبہ چکر کاٹتا ہو اس کے تصور کی کوشش کرنا سعی لاحاصل ہے۔ جب کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ اندرونی عالموں کی آخری حد ہے۔ ممکن ہے ان عالموں کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری مشاہدہ کی قوت کس قدر کمزور ہے، پھر سوال یہ ہے کہ پروٹان اور نیوٹران کے وہ انتہائی چھوٹے ذرے جو باہم مل کر مرکز (nucleous) بناتے ہیں وہ کس طرح قائم ہیں۔ آخر یہ پروٹان اور نیوٹران مرکز سے باہر کیوں نہیں نکل پڑتے۔ وہ کیا چیز ہے جو انھیں ایک دوسرے سے باندھے ہوئے ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان مادی ذرات کے درمیان ایک توانائی موجود ہے اور یہی توانائی مرکز کے برقی اور غیر برقی ذرات کو آپس میں جکڑے ہوئے ہے۔ اس کو طاقت یکجائی (Binding Energy) کا نام دیا گیا ہے۔ گویا مادہ اپنے آخری تجزیہ میں توانائی ہے، میں پوچھتا ہوں، کیا یہ توانائی قابل مشاہدہ چیز ہے۔ کیا کسی بھی خوردبین کے ذریعہ اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید سائنس نے خود یہ تسلیم کرلیا ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے اس کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اب اگر رسول کی بات کو ماننے کے لیے ہم یہ شرط لگائیں کہ وہ جن حقیقتوں کی خبر دے رہا ہے وہ ہمیں چھونے اور دیکھنے کو ملنی چاہئیں تب ہم اسے مانیں گے تو یہ ایک نہایت نامعقول بات ہوگی۔ یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے تاریخ ہند کا کوئی طالب علم ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے استاد سے کہے کہ کمپنی کے تمام کردار کو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دو اور وہ میرے سامنے تمام گزرے ہوئے واقعات کو دہرائیں، تب میں تمہاری تاریخ کو تسلیم کروں گا۔

پھر وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں دیکھ کر ہم یہ فیصلہ کریں کہ یہ دعوت صحیح ہے یا غلط، اور ہم کو اسے قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔ میرے نزدیک اس دعوت کو جانچنے کے تین خاص پہلو ہیں۔ اول یہ کہ اس کی توجیہ حقیقت سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زندگی کے انجام کے بارے میں اس کا دعویٰ محض دعویٰ ہے یا اس کی کوئی دلیل بھی اس کے یہاں ملتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس کے پیش کیے ہوئے کلام میں کیا ایسی کوئی نمایاں خصوصیت پائی جا رہی ہے کہ اس کو خدا کا کلام کہا جا سکے۔ ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے جب ہم رسول کے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر وہ نہایت کامیابی کے ساتھ پورا اتر رہا ہے۔

1۔ رسول نے کائنات کی جو توجیہ کی ہے اس میں ہماری تمام پیچیدگیوں کا حل موجود ہے۔ ہمارے اندر اور ہمارے باہر جتنے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سب کا وہ بہترین جواب ہے۔

2۔ زندگی کے انجام کے بارے میں اس کا جو دعویٰ ہے اس کے لیے وہ ایک قطعی دلیل بھی اپنے پاس رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زندگی میں وہ اس انجام کا ایک نمونہ ہمیں دکھا دیتا ہے جس کو بعد کی زندگی میں آنے کی وہ خبر دے رہا ہے۔

3۔ وہ جس کلام کو خدا کا کلام کہتا ہے اس کے اندر اتنی غیر معمولی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ یقیناً یہ ایک فوق الانسانی طاقت کا کلام ہے۔ کسی انسان کا کلام ایسا نہیں ہوسکتا۔

آئیے اب ان تینوں پہلوؤں سے رسول کی دعوت کا جائزہ لیں۔

پیغمبر کی صداقت

1۔ اس کی پہلی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی پیدائش جس فطرت پر ہوئی ہے وہی فطرت اس توجیہ کی بھی ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد ایک خدا کے وجود پر رکھی گئی ہے، اور ایک خدا کا شعور انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے دو نہایت مضبوط قرینے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی تاریخ کے تمام معلوم زمانوں میں انسانوں کی اکثریت بلکہ تقریباً ان کی تمام تعداد نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ انسان پر کبھی بھی ایسا کوئی دور نہیں گزرا ہے جب اس کی اکثریت خدا کے شعور سے خالی رہی ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر آج تک انسانی تاریخ کی متفقہ شہادت یہی ہے کہ خدا کا شعور انسانی فطرت کا نہایت طاقتور شعور ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ انسان پر جب کوئی نازک وقت آتا ہے تو اس کا دل بے اختیار خدا کو پکار اٹھتا ہے، جہاں کوئی سہارا نظر نہیں آتا، وہاں وہ خدا کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ جاہل ہو یا عالم۔ خدا پرست ہو یا ملحد، روشن خیال ہو یا تاریک خیال جب بھی اس پر کوئی ایسا وقت گزرتا ہے جہاں عام انسانی قوتیں جواب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں تو وہ ایک ایسی ہستی کو پکارتا ہے جو تمام طاقتوں سے بڑھ کر طاقتور ہے اور جو تمام طاقتوں کا خزانہ ہے۔ انسان اپنے نازک ترین لمحات میں خدا کو

یاد کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ہمیں اسٹالن کی زندگی میں ملتی ہے جس کا ذکر مسٹر چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے حالات کے متعلق اپنی کتاب کی چوتھی جلد صفحہ 433 میں کیا ہے۔ 1942ء کے نازک حالات میں جب کہ ہٹلر سارے یورپ کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا، چرچل نے ماسکو کا سفر کیا تھا، اس موقع پر چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجی کارروائی کے متعلق اپنی اسکیم کی تفصیلات بتائیں۔ چرچل کا بیان ہے کہ اسکیم کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب کہ اسٹالن کی دلچسپیاں اس سے بہت بڑھ چکی تھیں، اس کی زبان سے نکلا — خدا اس مہم کو کامیاب کرے"۔

"May God prosper this undertaking"

(Winston S. Churchill, *The Second World War*, (Abridgement) Cassell & Company, London, 1965, p.603)

اسی کے ساتھ نبی کی آواز کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ ان تمام سوالات کی مکمل توجیہ ہے جو انسان معلوم کرنا چاہتا ہے اور جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ کائنات کے مطالعہ نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ یہ محض اتفاق سے نہیں پیدا ہوسکتی، ضرور اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہونا چاہیے۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ ہم کو نظر آرہا تھا کہ کائنات محض ایک مادی مشین نہیں ہے اس کے پیچھے کوئی غیر معمولی ذہن ہونا اکٹھا جو اسے چلا رہا ہو۔ اس توجیہ میں اس سوال کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو اپنے محسن کی تلاش تھی اور ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جو ہمارا سہارا بن سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ ہم کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہورہی تھی یہ انسانی زندگی اتنی مختصر کیوں ہے۔ ہم اس کو لامحدود دیکھنا چاہتے تھے۔ ہم اپنے لیے ایک ایسے وسیع میدان کی تلاش میں تھے جہاں ہماری امنگوں کی تکمیل ہو سکے۔ اس توجیہ میں اس کا جواب بھی موجود ہے۔ پھر انسانی حالات کا شدید تقاضا تھا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا

باطل ہونا واضح ہو اور اچھے اور بُرے الگ الگ کر دیے جائیں۔ ہر ایک کو اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ اس سوال کا جواب بھی اس توجیہ میں موجود ہے۔ غرض زندگی سے متعلق سارے سوالات کا مکمل جواب ہے اور اتنا بہتر جواب ہے کہ اس سے بہتر جواب کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس سے وہ سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔

2۔ اس کی دعوت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے انجام کے بارے میں وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے اس کا ایک واقعاتی نمونہ خود اپنی زندگی میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا اسی طرح ظالم اور مظلوم کو لیے ہوئے ختم نہیں ہو جائیگی بلکہ اسکے انجام پر کائنات کا رب ظاہر ہوگا اور سچوں اور جھوٹوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دے گا۔ اس دن کے آنے میں جو دیر ہے وہ صرف اس مہلتِ کار کے ختم ہونے کی ہے جو تمہارے لیے مقدر ہے۔

یہ بات وہ صرف کہہ کر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ اسی کے ساتھ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس عدالت کا ایک نمونہ مالک کائنات میرے ذریعہ سے اسی دنیا میں تم کو دکھائے گا۔ میرے ذریعہ سے وہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرے گا، اپنے فرماں برداروں کو عزت دے گا اور اپنے نافرمانوں کو ذلیل کر کے انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا۔ یہ واقعہ بہر حال ظہور میں آئے گا خواہ دنیا کے لوگ کتنی ہی مخالفت کریں اور ساری طاقت اس کے مٹانے پر لگا دیں جس طرح آخرت کا ہونا قطعی طور پر مقدر ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اسی طرح میری زندگی میں اس کا نمونہ دکھایا جانا بھی لازمی ہے، یہ ایک نشان ہوگا آنے والے دن کا اور یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ کائنات کی تعمیر عدل پر ہوئی ہے اور یہ کہ میں جس طاقت کا نمائندہ ہوں وہ ایک ایسی طاقت ہے

جس کی طاقت سب پر بالا ہے یہ طاقت ایک روز تم کو اپنے سامنے کھڑا کر کے تمام اگلے پچھلے انسانوں کا فیصلہ کرے گی۔

یہ چیلنج وہ اس وقت دیتا ہے جب کہ وہ تنہا ہے، پوری قوم اس کی دشمن ہو گئی ہے، خود اپنا ملک اس کو جگہ دینے کے لیے تیار نہیں، اس کے قریب ترین اعزا نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس کے پاس مادی وسائل وذرائع میں سے کچھ بھی نہیں۔ ایسا ایک شخص پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ میں غالب ہوں گا اور میرے ذریعہ سے خدا کی عدالت زمین پر قائم ہو گی۔ سننے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں مگر وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنا کام کرتا چلا جارہا ہے ملک کی اکثریت اس کے قتل کا فیصلہ کرتی ہے، اس کی معاشیات تباہ کر دیتی ہے، اس کو جلاوطنی پر مجبور کرتی ہے۔ اس کو مٹانے پر اپنا سارا زور صرف کر دیتی ہے، مگر اس کے مقابلہ میں یہ سب کچھ بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت تھوڑے لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں، ایک طرف معمولی اقلیت ہوتی ہے اور دوسری طرف زبردست اکثریت۔ ایک طرف سازوسامان ہوتا ہے اور دوسری طرف بے سروسامانی۔ ایک طرف ملکی باشندوں اور ہمسایہ قوموں کی حمایت ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنوں اور غیروں کی متفقہ مخالفت حالات کی انتہائی ناسازگاری سے اس کے ساتھی اکثر گھبرا اٹھتے ہیں مگر وہ ہر بار یہی کہتا ہے کہ انتظار کرو خدا کا فیصلہ آ کر رہے گا، اس کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

اس کے چیلنج پر چوتھائی صدی بھی گزرنے نہیں پاتی کہ وہ مکمل شکل میں پورا ہو جاتا ہے اور تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ظہور میں آتا ہے کہ ایک شخص نے جن دعووں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا تھا ٹھیک اسی شکل میں اس کا دعویٰ پورا ہوا اور اس کے مخالفین اس میں کوئی کمی بیشی نہ کر سکے۔ حق اور باطل الگ الگ ہو گیا۔ خدا کے فرماں برداروں کو عزت اور غلبہ حاصل ہوا، اور خدا کے نافرمانوں کا زور توڑ کر انھیں محکوم بنا دیا گیا۔

اس طرح اس دعوت نے انسانوں کے لیے جب انجام کی خبر دی تھی اس کا ایک نمونہ دنیا میں قائم کر دیا گیا جو قیامت تک کے لیے عبرت کا نشان ہے، اس نمونہ کی تکمیل آخرت میں ہوگی جب سارے انسانوں کو خدا کی عدالت میں حاضر کر کے ان کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

3۔ اس شخص کے دعوے کے برحق ہونے کا تیسرا ثبوت وہ کلام ہے جس کو وہ کلام الٰہی کہہ کر پیش کرتا ہے۔ اس کلام کے اوپر کتنی ہی صدیاں گذر چکی ہیں مگر اس کی عظمت، اس کی سچائی اور حقیقت کے بارے میں اس کے بیان کا ایک حرف بھی غلط ثابت نہ ہو سکا جب کہ کوئی بھی انسانی کتاب ایسی نہیں ہے جو ان نقائص سے پاک ہو۔

دوسرے لفظوں میں قرآن بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں مگر میں یہاں صرف تین پہلوؤں کا ذکر کروں گا، ایک اس کا غیر معمولی انداز بیان، دوسرے اس کے معانی کا تضاد سے پاک ہونا، تیسرے اس کی ابدیت۔

قرآن اپنی دلیل آپ

1۔ قرآن ایک غیر معمولی کلام ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ایک ایسے بلند مقام سے بول رہا ہے جو کسی بھی انسان کو حاصل نہیں۔ اس کی عبارتوں کا شکوہ، اس کی بے پناہ روانی اور اس کا فیصلہ کن انداز بیان اتنا حیرت انگیز طور پر انسانی کلام سے مختلف ہے کہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالک کائنات کی آواز ہے کسی انسان کی آواز نہیں۔ اس کا پر یقین اور باعظمت کلام خود ہی بول رہا ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے جس میں خدا اپنے بندوں سے مخاطب ہوا ہے۔ قرآن میں کائنات کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ انسان کے انجام کی خبر دی گئی ہے اور زندگی سے

متعلق تمام کھلے اور چھپے حالات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس قدر قطعی انداز میں بیان ہوا ہے کہ واقعہ کا اظہار واقعہ کا مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آدمی کو حقیقت کا علم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ اس کو حقیقت کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ وہ واقعہ کو کتاب کے صفحات میں نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ اسکرین کے اوپر اس کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کلام کی یہ قطعیت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ یہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جس کو حقیقتوں کا براہ راست علم ہے۔ کوئی انسان جو حقیقتوں کا ذاتی علم نہ رکھتا ہو، وہ اپنے کلام میں ہرگز ایسا زور پیدا نہیں کرسکتا۔ یہاں میں نمونہ کے طور پر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت نقل کروں گا:

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ۔ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ۔ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ۔ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ۔ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ۔ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ۔ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ۔ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ۔ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ۔ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ۔ كِرَامًا كَاتِبِينَ۔ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ۔ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ۔ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ۔ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ۔ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ (82:1-19)۔ یعنی، جب آسمان پھٹ جائے گا، جب ستارے بکھر جائیں گے، جب دریا ابل پڑیں گے، جب قبریں الٹ دی جائیں گی، اس دن ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا اے انسان تجھ کو خدائے عظیم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال

رکھا ہے۔جس نے تجھے خلق کیا تیرا تسویہ فرمایا اور پھر مناسبت قائم کی ہے۔

(who created you, fashioned you and proportioned you)

اس نے جیسا چاہا ویسا تم کو بنایا، نہیں بلکہ تم فیصلہ (کے دن) کا انکار کرتے ہو۔ حالاں کہ تمہارے اوپر نگہبان مقرر ہیں صحیح صحیح لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ یقیناً اچھے لوگوں کے لیے نعمتیں ہیں اور یقیناً برے لوگوں کے لیے جہنم ہے۔ وہ فیصلہ کے روز اس میں ڈالے جائیں گے اور وہ ہرگز اس سے بھاگ نہیں سکتے اور کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ کا دن کیا ہے پھر کیا تم جانتے ہو کہ فیصلہ کا دن کیا ہے وہ ایک ایسا دن ہے جب کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لیے کچھ نہ کر سکے گا اور اس دن اقتدار صرف خدا کے لیے ہوگا۔

کس قدر یقین سے بھرا ہوا ہے یہ کلام جس میں زندگی کی ابتدا اور انتہا سب کچھ بیان کر دی گئی ہے۔ کوئی بھی انسانی کتاب جو زندگی اور کائنات کے موضوع پر لکھی گئی ہو، اس یقین کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ سیکڑوں سال سے انسان کائنات کی حقیقت پر غور کر رہا ہے۔ بڑے بڑے فلسفی اور سائنس داں پیدا ہوئے، مگر کوئی اس یقین کے ساتھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ سائنس آج بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ کسی قطعی اور صحیح علم سے ابھی بہت دور ہے جب کہ قرآن اس قدر یقین کے ساتھ بات کہتا ہے گویا وہ علم کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور حقیقت سے آخری حد تک واقف ہے۔

2۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس نے مابعد الطبیعی حقائق سے لے کر تمدنی مسائل تک تمام اہم امور پر گفتگو کی ہے مگر کہیں بھی اس کے بیانات میں تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کلام کے اوپر تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پورے ہو رہے ہیں۔ اس دوران میں بہت سی نئی نئی باتیں انسان کو معلوم ہوئی ہیں مگر اس کی باتوں

میں اب بھی کوئی تضاد ظاہر نہ ہوسکا، حالاں کہ انسانوں میں سے کسی ایک فلسفی کا بھی اس حیثیت سے نام نہیں لیا جا سکتا کہ اس کا کلام تضاد اور اختلاف سے پاک ہے۔ اس دوران میں ہزاروں فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی عقل سے زندگی اور کائنات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت جلد ان کے کلام کا تضاد ظاہر ہو گیا اور زمانہ نے انھیں رد کر دیا۔

کسی کلام کا تضاد سے پاک ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت سے کلی مطابقت رکھتا ہے۔ جو شخص حقیقتوں کا علم نہ رکھتا ہو یا صرف جزئی علم اسے حاصل ہو وہ جب بھی حقیقت کو بیان کرنے بیٹھے گا لازمی طور پر تضادات کا شکار ہو جائے گا۔ وہ ایک پہلو کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے پہلو کی رعایت نہ کر سکے گا۔ وہ ایک رخ کو کھولے گا تو دوسرے رخ کو بند کر دے گا۔ زندگی اور کائنات کی توجیہ کا سوال ایک ہمہ گیر سوال ہے۔ اس کے لیے ساری حقیقتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر ساری حقیقتوں کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ سارے پہلوؤں کی رعایت بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے فلسفوں میں تضاد کا پایا جانا لازمی ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کہ وہ اس قسم کے تضادات سے پاک ہے اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ حقیقت کی صحیح ترین تعبیر ہے، اس کے سوا تمام تعبیریں غلط ہیں، اس واقعہ کو میں مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔

1۔ زندگی کے موضوع پر جو کتاب لکھی جائے اس کا ایک ضروری باب زندگی کے فرائض متعین کرنا ہے۔ یہ فرائض متعین کرنے میں ضروری ہے کہ ان کے مختلف پہلوؤں کی ٹھیک ٹھیک رعایت کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک پہلو سے کوئی ایسا حکم دیا جائے جو دوسرے پہلو سے ٹکراتا ہو۔ مثلاً عورت اور مرد کی حیثیت متعین کرنا تمدنی زندگی کا ایک

اہم مسئلہ ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور نے یہ قرار دیا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات ہونی چاہیے اور زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں کو یکساں طور پر کام کرنے کا موقع دینا چاہیے، مگر یہاں انسانی ساخت کا یہ تمدنی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا رہا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ دونوں یکساں طور پر زندگی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اس کے برعکس قرآن نے تمدنی زندگی میں عورت اور مرد کا جو مقام متعین کیا ہے وہ دونوں کی پیدائشی ساخت کے عین مطابق ہے اور قانون اور حقیقت کے درمیان کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

2۔ مارکس نے انقلاب کا فلسفہ یہ بتایا ہے کہ جس طرح ایک عالم گیر قانون کشش سے ستارے حرکت کر رہے ہیں اسی طرح کچھ ناگزیر تاریخی قوانین ہیں جو سماجی تبدیلیوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہ قوانین مسلسل طور پر اپنا کام کر رہے ہیں اور اسی کے مطابق انسانی زندگی میں انقلابات آتے ہیں مگر اس فلسفہ کو مرتب کرنے کے ساتھ ہی اس نے یہ نعرہ بھی لگایا کہ:

"دنیا کے مزدورو! متحد ہو جاؤ"

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر سماجی تبدیلیوں کا کوئی ناگزیر تاریخی قانون ہے تو سیاسی جدوجہد کی ضرورت نہیں اور اگر سیاسی جدوجہد کے ذریعہ انقلاب آتا ہے تو پھر ناگزیر تاریخی قانون کے کیا معنیٰ۔

اس کے برعکس قرآن انسانی ارادہ کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مادی دنیا کی طرح ان واقعات کی کوئی لازمی منطق نہیں ہے۔ بلکہ انسانی کوشش انھیں کوئی بھی شکل دے

سکتی ہے۔ یقیناً فطرت کے کچھ قوانین ہیں اور اس سلسلہ میں وہ اہم کام کرتے ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انسانی کوششوں کا ساتھ دے کر اسے منزل تک پہنچا دیتے ہیں نہ کہ خود انسانی کوششیں ان قوانین کا خارجی ظہور ہیں۔ اس طرح قرآن کے نظریہ اور اس کی دعوت میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جب اپنے نظریہ کو قائم کرنے کے لیے لوگوں کو پکارتا ہے تو وہ اپنے فلسفہ کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ اس کی تردید۔ اس کے برعکس مارکسی فلسفہ اس کے عملی پروگرام سے صاف ٹکرا رہا ہے، کمیونسٹ پارٹیوں کا وجود حقیقی معنوں میں مارکسی فلسفہ کی تردید ہے، کمیونسٹ مینی فسٹو کا آخری فقرہ اس کے پہلے فقرہ کو رد کر دیتا ہے۔

قرآن کی تعلیمات کو اگر آپ انسانی فلسفوں کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھیں تو اس قسم کی بہت مثالیں پائیں گے۔

3۔ قرآن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے زمین پر موجود ہے۔ اس زمانے میں کتنے انقلابات آئے ہیں، تاریخ میں کتنی الٹ پلٹ ہوئی ہے، زمانہ نے کتنی کروٹیں بدلی ہیں، مگر اب تک اس کی کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ وہ ہر زمانہ کے عقلی امکانات اور تمدنی ضروریات کا مسلسل ساتھ دیتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی تعلیمات کی ہمہ گیری کسی مقام پر بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانہ کے مسائل پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ اس کتاب عظیم کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی انسانی کتاب کو اب تک حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ہر فلسفہ چند ہی دنوں بعد اپنی غلطی ظاہر کر دیتا ہے، مگر صدیوں پر صدیاں گزرتی جا رہی ہیں اور اس کتاب کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ قانون اس قت بنایا گیا تھا جب عرب کے غیر متمدن اور منتشر قبائل میں اسلامی ریاست قائم کرنے کا مسئلہ درپیش تھا، مگر اس کے بعد صدیوں تک وہ اسلامی حکومتوں کی

تمام ضرورتیں پوری کرتا رہا اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی نہ صرف یہ کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے بلکہ صرف وہی ایک ایسا نظام ہے جو حقیقی معنوں میں زندگی کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے جس طرح اس نے اپنی برتری ثابت کی تھی آج بھی وہ اسی طرح تمام فلسفوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ زندگی کے بارے میں اس نے جو نظریات پیش کیے تھے اور فرد اور جماعت کے عمل کے لیے جو خاکہ تجویز کیا تھا وہ آج بھی نہ تو پرانا ہوا ہے اور نہ اس میں کسی نقص کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اس دوران میں کتنے فلسفے پیدا ہوئے اور مر گئے کتنے نظام بنے اور بگڑ گئے مگر قرآن کے نظریہ کی صداقت اور اس کے عملی نظام کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔ وہ ہوا اور پانی کی طرف زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔

میں یہاں دونوں پہلوؤں سے ایک ایک مثال پیش کروں گا۔

قرآن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کائنات کا محرک ایک ذہن ہے جو بالا رادہ اسے حرکت دے رہا ہے۔ قرآن نے یہ دعویٰ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے بہت پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سے فلسفی اور سائنس داں اٹھے جنھوں نے بڑے زور شور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ کائنات محض ایک مادی مشین ہے جو خود بخود حرکت کر رہی ہے۔ یہ نظریہ دوسو برس تک انسانی ذہنوں پر حکومت کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہوا کہ علم کی ترقی نے قرآن کے دعویٰ کو رد کر دیا ہے۔ مگر اس کے بعد خود کائنات کے مطالعہ سے سائنس دانوں پر یہ منکشف ہوا کہ زندگی اور کائنات کی توجیہ محض مادی قوانین کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی اب سائنس دن بہ دن قرآن کے اس نظریہ کی طرف لوٹ رہی ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ذہن ہے جو اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے۔ مشہور سائنس داں سر جیمز جینز اس تبدیلی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علم کے دریا نے پچھلے چند برسوں میں نہایت تیزی سے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے۔

تیس سال پہلے ہمارا خیال تھا یا ہم نے فرض کرلیا تھا کہ ہم ایک ایسی آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکٹھا ہو گئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لے ایک بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اس خالص مشینی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی ایک حادثہ کے طور پر بالکل اتفاق سے آپہنچی ہے۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لیے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے ہیں۔ مگر موجودہ معلومات کی روشنی میں طبعیات کی حد تک سائنس کا اب اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر مشینی حقیقت (Non-Mechanical Reality) کی طرف لے جا رہا ہے۔

اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے: جدید معلومات ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم اپنے پچھلے خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لیے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں آپڑے ہیں جس کو خود زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے یا وہ باقاعدہ طور پر زندگی سے عداوت رکھتی ہے۔ اب ہم نے دریافت کرلیا ہے کہ کائنات ایک ایسی خالق یا مدبر طاقت (Designing or Controlling Power) کا ثبوت فراہم کررہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔

(ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحہ 104)

یہ نظری پہلو کی مثال تھی، اب عملی پہلو سے متعلق ایک مثال لیجئے۔ اسلام نے معاشرتی زندگی کا جو قانون بنایا ہے اس میں ایک مرد کو اجازت دی ہے کہ وہ چار عورتوں

تک سے شادی کر سکتا ہے۔ اسلام کے بعد جب مغربی تہذیب اٹھی تو اس نے اس قانون کا بہت مذاق اڑایا اور اس کو جاہلیت کے زمانہ کا وحشی قانون قرار دیا۔ اس کے نزدیک یہ قانون عورتوں کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی اور اس بنیاد پر کبھی بھی کوئی ترقی یافتہ تمدن تعمیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مسیحیت میں اگرچہ اس کی گنجایش موجود تھی مگر مغربی تہذیب نے اس کو یک قلم اپنے یہاں سے خارج کر دیا اور اس کو ایک نہایت ذلیل فعل قرار دیا کہ کوئی شخص ایک عورت رکھتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرے۔ اس کی تبلیغ اس زور شور سے کی گئی کہ اب یہ حال ہے کہ نہ کوئی مرد اس کی جرأت کر سکتا ہے اور نہ کوئی عورت اپنے بارے میں ایسا سوچ سکتی ہے کہ وہ کسی شخص کی دوسری یا تیسری بیوی بنے۔

مگر حالات نے، اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے حالات نے، اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دراصل زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے۔ کبھی بعض افراد کی زندگی میں اور کبھی پوری جماعت کے لیے ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یا تو فواحش اور بدکاری کو قبول کیا جائے جس کا مطلب پورے تمدن کو ہولناک خطرہ میں مبتلا کر دینا ہے یا تعدد ازواج کو اختیار کیا جائے جس سے مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ان تمام ملکوں میں جو جنگ میں شریک تھے، یہ صورت حال پیش آئی کہ عورتیں زندہ رہیں اور مرد کثرت سے ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی جس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔

1955ء کے اعداد و شمار کے مطابق جاپان میں ہر ایک مرد کے مقابلہ میں آٹھ عورتیں تھیں۔ اس جنگ کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا جہاں بے شمار عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہو گئے اور لڑکیوں کے لیے شوہر ملنا مشکل ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ان ملکوں میں لاوارث

اور ناجائز بچوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ جو یتیم ہو گئے تھے ان کا کوئی وارث نہیں رہا اور جو عورتیں شوہر سے محروم ہو گئی تھیں انھوں نے فطری تقاضے سے مجبور ہو کر اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے شروع کر دیے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جرمنی میں بعض عورتوں کے گھروں پر اس قسم کا بورڈ نظر آنے لگا کہ:

Wanted an Evening Guest

یعنی، رات گزارنے کے لیے ایک مہمان چاہیے۔

دوسری جنگ عظیم میں لڑنے والے ملکوں کے بیشمار مرد مارے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں شادی شدہ زندگی سے مایوس ہو کر طوائف کی زندگی گزارنے لگیں۔ جیمز کیمروں (James Cameron) دوسری جنگ عظیم میں جرمنی میں نامہ نگار تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی یادداشت شائع کی ہے۔ یہ برطانی نامہ نگار اس میں لکھتا ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر جب میں برلن گیا تو شکست خوردہ شہر بنیادی طور پر بھوکی طوائفوں (Hungry Whores) سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ذہن سے نکالنا چاہا مگر میں نہ نکال سکا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

It is not so much that I have no stomach for the fight, I had no stomach for the victory.

ایسا نہ تھا کہ جنگ کی برداشت کی طاقت مجھ میں نہ ہو۔ مگر فتح کو برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی (گارجین، 10 اکتوبر 1982ء)۔

اگرچہ مغربی ذہن نے ابھی تک اس معاملہ میں اپنی غلطی تسلیم نہیں کی ہے مگر واقعات نے صریح طور پر اس کا غلط ہونا ثابت کر دیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب زبان سے بھی اس کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ نکاح کے معاملہ میں جس اصول کو مغرب نے اختیار کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج کو فحاشی میں مبتلا کر کے بے شمار جرائم کا دروازہ

کھول دیا جائے۔ جب کہ اسلام کا اصول اصل مسئلہ کو بہترین طریقہ پر حل کرتا ہے اور سماج کو بہت شدید نقصانات سے بچالیتا ہے۔

قرآن کے نظریات اور اس کے قوانین کی ابدیت کی یہ دو مثالیں تھیں جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسانی ساخت کے نظریے اور قوانین بن بن کر بگڑتے رہے مگر قرآن نے پہلے دن جو کچھ کہا تھا آخر دن تک اس کی سچائی میں کوئی فرق نہیں آیا وہ پہلے جس طرح حق تھا آج بھی اسی طرح حق ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہے جس کا علم ماضی اور مستقبل پر محیط ہے۔ قرآن کی ابدیت قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

آخری بات

ہمارے مطالعہ نے اب ہمارے لیے حقیقت کے دروازے کھول دیے ہیں۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز اس سوال سے کیا تھا کہ ''ہم کیا ہیں اور یہ کائنات کیا ہے''اس کا جواب بہت سے لوگوں نے اپنے ذہن سے دینے کی کوشش کی ہے، مگر ہم نے دیکھا کہ یہ جوابات حقیقت کی صحیح تشریح نہیں کرتے۔ پھر ہمارے کانوں میں عرب سے نکلی ہوئی ایک آواز آئی۔ ہم نے اس پر غور کیا، اس کو کائنات کے فریم میں رکھ کر دیکھا، انسانی تاریخ میں اسے آزمایا اور فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر اس کو پہچاننے کی کوشش کی۔ ہم نے دیکھا کہ کائنات، تاریخ اور انسانی نفسیات متفقہ طور پر اس کی تصدیق کر رہے ہیں، ہمارا تمام علم اور ہمارے بہترین احساسات بالکل اس کی تائید میں ہیں۔ جس حقیقت کی ہمیں تلاش تھی اس کو ہم نے پالیا۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

سچائی کیا ہے، یہ ہر عورت اور ہر مرد کا سوال ہے۔ ہر پیدا ہونے والا اِس سوال کو لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اِس سوال کا جواب کیا ہے، اِس کو جاننے کا ایک ہی راستہ ہے، اور وہ ہے — گہرائی کے ساتھ اِس سوال پر غور کرنا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈھونڈنے والا پاتا ہے۔ اِسی طرح سچائی کو صرف وہ انسان پاتا ہے جو اُس کو ڈھونڈے، جو سچائی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنا لے۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-93-9547-950-9

₹25